ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 413

Program: B.A

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: عمرانیات II (413) • سطح: بی۔اے۔ (بیچلر)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ 1 تا 4)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر (بی۔اے۔): 40

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ و حوالہ کے لیے)

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی متعلقہ کتابیں بغور پڑھیں اور جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں، تاکہ ان کی اپنی سمجھ بوجھ اور تحریری صلاحیت نکھرے۔

USMAN NOTES www.usmannotes.com

سوال نمبر 1: سماجی تحقیق کے بنیادی مراحل اور معاشرتی مسائل کے حل میں تحقیق کا کردار (20 نمبر)

سوال نمبر 1: سماجی تحقیق کے بنیادی مراحل بیان کریں اور وضاحت کریں کہ تحقیق معاشرتی مسائل کے حل میں کس طرح مددگار ثابت ہوتی ہے۔ (20)

تعارف

سماجی تحقیق عمرانیات کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ اسی کے ذریعے معاشرے کے بارے میں اندازوں اور قیاس آرائیوں کی جگہ جانچی پرکھی ہوئی اور قابلِ اعتماد معلومات لے لیتی ہیں۔ انسان ازل سے اپنے اردگرد کے سماجی ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا آیا ہے، مگر عام مشاہدہ اکثر ادھورا، جانب دار اور گمراہ کن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سماجی تحقیق ایک منظم، مرحلہ وار اور سائنسی عمل ہے جس میں مسئلے کی نشاندہی سے لے کر نتائج اور سفارشات تک ہر قدم ایک خاص ترتیب اور اصول کے تحت اٹھایا جاتا ہے۔ جب تک ہمیں کسی معاشرتی مسئلے، مثلاً غربت، ناخواندگی، بے روزگاری یا منشیات کے استعمال، کی اصل وجوہات، اس کی وسعت اور اس کے اثرات کا صحیح علم نہ ہو، اس کا پائیدار

حل تلاش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی لیے جدید دور میں حکومتیں، منصوبہ ساز ادارے اور غیر سرکاری تنظیمیں پالیسی سازی سے پہلے تحقیق پر انحصار کرتی ہیں۔ ذیل میں پہلے سماجی تحقیق کے بنیادی مراحل تفصیل سے بیان کیے جائیں گے اور پھر یہ واضح کیا جائے گا کہ یہ تحقیق معاشرتی مسائل کے حل میں کس طرح مددگار ثابت ہوتی ہے۔

سماجی تحقیق سے مراد

سماجی تحقیق سے مراد سماجی مظاہر، انسانی رویوں، اداروں اور عوامل کا منظم طریقے سے مطالعہ ہے، جس کا مقصد نئے حقائق دریافت کرنا، موجودہ معلومات کی تصدیق کرنا اور سماجی زندگی کے بارے میں باقاعدہ اصول وضع کرنا ہوتا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ یہ منظم ہوتی ہے، یعنی پہلے سے طے شدہ مراحل کے مطابق آگے بڑھتی ہے؛ معروضی ہوتی ہے، یعنی محقق اپنی ذاتی پسند ناپسند اور تعصب کو نتائج پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا؛ تجرباتی مشاہدے پر مبنی ہوتی ہے، یعنی ہر دعویٰ مشاہدے اور مواد سے ثابت کیا جاتا ہے؛ اور اس کے نتائج کی جانچ پڑتال دوسرے محققین بھی کر سکتے ہیں۔ یہی خصوصیات تحقیق کو محض رائے یا اندازے سے ممتاز کرتی ہیں اور اسے مسائل کے حل کے لیے قابلِ اعتماد بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

پہلا مرحلہ: مسئلے کا انتخاب اور اس کی واضح تعریف

تحقیق کا پہلا اور سب سے اہم مرحلہ مسئلے کا انتخاب اور اس کی واضح، محدود اور قابلِ مطالعہ تعریف ہے۔ محقق اپنی دلچسپی، سماجی ضرورت، دستیاب وسائل اور وقت کو مدِ نظر رکھ کر کوئی موضوع منتخب کرتا ہے، مثلاً "شہری نوجوانوں میں بے روزگاری کے سماجی اثرات"۔ اس کے بعد مسئلے کو اس قدر واضح کیا جاتا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ کن سوالات کے جوابات تلاش کیے جائیں گے، کن افراد یا گروہوں کا مطالعہ ہو گا اور کن پہلوؤں کو شامل یا خارج رکھا جائے گا۔ اگر مسئلہ دھندلا اور بے قابو ہو تو پوری تحقیق بے سمت ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے پر محقق یہ بھی طے کرتا ہے کہ تحقیق کا مقصد خالص علمی ہے، یعنی نظریہ سازی، یا اطلاقی ہے، یعنی کسی عملی مسئلے کا حل تلاش کرنا، کیونکہ مقصد ہی آگے کے تمام مراحل کی سمت متعین کرتا ہے۔

دوسرا مرحلہ: متعلقہ ادب کا جائزہ اور نظری ڈھانچہ

مسئلہ متعین ہونے کے بعد محقق اس موضوع پر پہلے سے موجود کتب، مقالوں، رپورٹوں اور تحقیقات کا جائزہ لیتا ہے۔ اس جائزے سے اسے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلے کے کون سے پہلو پہلے زیرِ بحث آ چکے ہیں، کن نظریات کی روشنی میں اسے سمجھا گیا ہے، اور کون سے خلا اب بھی باقی ہیں جنہیں اس کی تحقیق پُر کر سکتی ہے۔ ادب کا جائزہ دوہری مہارت سے بچاتا ہے، مفاہیم کی وضاحت کرتا ہے اور محقق کو موزوں نظری ڈھانچہ فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جرم کے مطالعے میں سماجی بے ترتیبی یا کشیدگی کے نظریات محقق کی رہنمائی کرتے ہیں کہ وہ کن عوامل پر توجہ دے۔ اسی مرحلے پر اہم اصطلاحات کی عملی تعریفیں بھی طے کی جاتی ہیں تاکہ بعد میں پیمائش میں ابہام نہ رہے۔

تیسرا مرحلہ: مفروضے کی تشکیل

مفروضہ کسی مسئلے کے بارے میں ایک عارضی، مگر جانچ کے قابل بیان ہوتا ہے جو دو یا دو سے زیادہ عناصر کے درمیان متوقع تعلق کو ظاہر کرتا ہے، مثلاً "تعلیم کی سطح بڑھنے سے خاندانی منصوبہ بندی کی طرف رجحان بڑھتا ہے"۔ مفروضہ تحقیق کو سمت دیتا ہے، یہ بتاتا ہے کہ کون سا مواد اکٹھا کیا جائے اور کس تعلق کو پرکھا جائے۔ ہر مفروضہ لازمی طور پر درست ثابت نہیں ہوتا؛ تحقیق اسے قبول یا رد کرتی ہے اور دونوں صورتوں میں علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں موضوع بالکل نیا ہو اور مفروضہ بنانا ممکن نہ ہو، وہاں محقق تحقیقی سوالات وضع کر کے آگے بڑھتا ہے۔ مفروضے کی اچھی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ وہ واضح، مختصر، قابلِ پیمائش اور موجودہ علم سے مربوط ہو۔

چوتھا مرحلہ: تحقیقی خاکہ اور طریقِ کار کا انتخاب

اس مرحلے پر محقق تحقیقی خاکہ تیار کرتا ہے، یعنی یہ طے کرتا ہے کہ تحقیق سروے کی صورت میں ہوگی، تجرباتی ہوگی، تاریخی ہوگی یا کسی ایک واقعے کا گہرا مطالعہ (کیس اسٹڈی) ہوگی۔ اسی کے ساتھ وہ آبادی اور نمونے کا تعین کرتا ہے، کیونکہ پوری آبادی کا مطالعہ اکثر ممکن نہیں ہوتا، اس لیے نمونے گیری کے سائنسی اصولوں کے مطابق چند افراد کو اس طرح منتخب کیا جاتا ہے کہ وہ پوری آبادی کی نمائندگی کریں۔ پھر مواد اکٹھا کرنے کے آلات طے کیے جاتے ہیں، مثلاً سوالنامہ، انٹرویو کا شیڈول، مشاہدہ یا دستاویزات کا مطالعہ۔ محقق کو ان آلات کی صداقت اور اعتبار کی جانچ بھی کرنی چاہیے۔ اچھا تحقیقی خاکہ وقت، لاگت اور محنت کی بچت کرتا ہے اور نتائج کی ساکھ بڑھاتا ہے۔

پانچواں مرحلہ: مواد کا اکٹھا کرنا

منصوبہ تیار ہونے کے بعد عملی طور پر میدان سے مواد اکٹھا کیا جاتا ہے۔ یہ تحقیق کا سب سے محنت طلب مرحلہ ہے، کیونکہ نتائج کی درستی اسی مواد کے معیار پر منحصر ہوتی ہے۔ محقق کو جواب دہندگان کا اعتماد حاصل کرنا، ان کی رضامندی لینا، معلومات کی رازداری کی یقین دہانی کرانا اور غیر جانب دار رہ کر جوابات درج کرنا ہوتے ہیں۔ مواد بنیادی بھی ہو سکتا ہے، جو محقق خود میدان سے حاصل کرے، اور ثانوی جو مردم شماری، سرکاری اعداد و شمار اور سابقہ رپورٹوں سے لیا جائے۔ اس مرحلے پر لاپروائی، جعل سازی یا جواب دہندگان پر دباؤ پوری تحقیق کو بے اعتبار کر سکتا ہے، اس لیے تحقیقی اخلاقیات کی پابندی اس مرحلے کی روح ہے۔

چھٹا مرحلہ: مواد کی درجہ بندی، تجزیہ اور تشریح

اکٹھا کیا گیا خام مواد بکھرا ہوا ہوتا ہے؛ اسے پہلے جانچ کر مکمل اور درست اندراجات چھانٹے جاتے ہیں، پھر آسان نوعیت کی معلومات کو جماعتوں میں تقسیم کر کے جدولوں اور فیصدوں کی شکل دی جاتی ہے۔ اس کے بعد شماریاتی یا معیاری طریقوں سے تجزیہ کیا جاتا ہے تاکہ رجحانات، فرق اور باہمی تعلقات سامنے آئیں۔ تجزیہ سے آگے کا قدم تشریح ہے، یعنی یہ بتانا کہ یہ نتائج کیا معنی رکھتے ہیں، مفروضہ ثابت ہوا یا رد، اور نتائج موجودہ نظریات سے کس طرح میل کھاتے یا مختلف ہیں۔ اچھی تشریح میں محقق اپنی تحقیق کی حدود بھی ایمان داری سے بیان کرتا ہے تاکہ قاری نتائج کو درست تناظر میں سمجھ سکے۔

ساتواں مرحلہ: رپورٹ کی تیاری اور نتائج کی اشاعت

آخری مرحلہ تحقیقی رپورٹ کی تیاری ہے جس میں مسئلہ، طریقِ کار، مواد، تجزیہ، نتائج اور سفارشات منظم انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔ رپورٹ کی زبان سادہ، واضح اور مصدقہ اصطلاحات پر مبنی ہونی چاہیے تاکہ پالیسی ساز، منتظمین اور عام قاری سب اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر تحقیق کی رپورٹ الماریوں میں دبی رہے تو اس کا سماجی فائدہ ختم ہو جاتا ہے؛ اس لیے نتائج کی اشاعت، سیمیناروں میں پیش کش اور متعلقہ اداروں تک رسائی بھی اسی مرحلے کا حصہ ہے۔ سفارشات عملی، وسائل کے اندر اور ترجیح کے لحاظ سے مرتب ہونی چاہئیں، ورنہ تحقیق محض علمی مشق بن کر رہ جاتی ہے۔

تحقیق معاشرتی مسائل کے حل میں کیسے مدد گار ہے؟

تحقیق سب سے پہلے مسئلے کی اصل نوعیت اور وسعت کو بے نقاب کرتی ہے۔ اکثر مسائل نظر آنے سے مختلف ہوتے ہیں؛ مثال کے طور پر کسی علاقے میں اسکول چھوڑنے کی شرح بلند ہو تو اندازے سے الزام والدین کی لاپروائی پر لگا دیا جاتا ہے، مگر تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ اصل سبب اسکول کا فاصلہ، نقل و حمل کی عدم دستیابی یا بچوں کی مزدوری ہے۔ جب سبب درست معلوم ہو جائے تو حل بھی درست سمت میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا، تحقیق مسائل کی وجوہات میں درجہ بندی کرتی ہے، یعنی یہ بتاتی ہے کہ کون سا عامل سب سے زیادہ اثر رکھتا ہے، تاکہ محدود وسائل پہلے اسی پر صرف کیے جائیں۔ تیسرا، تحقیق مختلف حلول کا تقابلی جائزہ دے کر بتاتی ہے کہ کون سا حل زیادہ مؤثر اور کم خرچ ہے؛ صحت کے شعبے میں ویکسینیشن مہمات کی منصوبہ بندی اسی طرح کی تحقیق پر مبنی ہوتی ہے۔

چوتھا، تحقیق پالیسی اور قانون سازی کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم کرتی ہے؛ مردم شماری اور سماجی سروے کے بغیر تعلیم، صحت اور روزگار کی منصوبہ بندی ممکن نہیں۔ پانچواں، تحقیق کسی پروگرام کے نفاذ کے بعد اس کی کامیابی اور ناکامی کا جائزہ بھی لیتی ہے، جسے تشخیصی تحقیق کہتے ہیں؛ اس فیڈبیک سے غلطیاں درست ہوتی ہیں اور آئندہ کے منصوبے بہتر بنتے ہیں۔ چھٹا، تحقیق عوامی شعور بیدار کرتی ہے، کیونکہ جب کسی مسئلے کے اعداد و شمار سامنے آتے ہیں تو میڈیا، اربابِ اختیار اور عوام سب اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پاکستان میں آبادی، غربت اور ناخواندگی کے بارے میں تحقیقی رپورٹوں نے ہی ان مسائل کو قومی ایجنڈے کا حصہ بنایا۔ یوں تحقیق مسئلے کی شناخت سے لے کر حل کے جائزے تک پورے عمل میں رہنما کا کردار ادا کرتی ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ سماجی تحقیق مسئلے کے انتخاب سے شروع ہو کر ادب کے جائزے، مفروضے کی تشکیل، تحقیقی خاکے، مواد کے حصول، تجزیے و تشریح اور رپورٹ تک ایک مربوط سلسلہ ہے، اور ہر مرحلہ اگلے مرحلے کی بنیاد بنتا ہے۔ یہی منظم عمل تحقیق کو معاشرتی مسائل کے حل کا مؤثر ذریعہ بناتا ہے، کیونکہ یہ قیاس کی جگہ شواہد، جذبات کی جگہ تجزیہ اور آزمائشی و خطائی طریقے کی جگہ جانچی ہوئی منصوبہ بندی فراہم کرتا ہے۔ جس معاشرے میں تحقیق کی روایت مضبوط ہوتی ہے، وہاں مسائل بگڑنے سے پہلے شناخت ہو جاتے ہیں اور ان کا حل سائنسی بنیادوں پر نکل آتا ہے۔

سوال نمبر 2: عمرانی نظریات کا تقابلی جائزہ—فعلیت پسندی اور تصادم نظریہ (20 نمبر)

سوال نمبر 2: مختلف عمرانی نظریات (مثلاً فعلیت پسندی، تصادم نظریہ) کا تقابلی جائزہ پیش کریں اور بیان کریں کہ یہ نظریات معاشرتی حقیقت کو مختلف انداز میں کیسے بیان کرتے ہیں۔(20)

تعارف

ہر علم اپنے مظاہر کو سمجھنے کے لیے نظریات کا سہارا لیتا ہے۔ عمرانی نظریہ معاشرے کے بارے میں خیالات کا ایک مربوط مجموعہ ہوتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ معاشرہ کیا ہے، اس کے حصے آپس میں کیسے جڑے ہوئے ہیں، اس میں استحکام یا تبدیلی کیوں آتی ہے، اور انسانی رویے کی اصل محرکات کیا ہیں۔ ایک ہی معاشرتی حقیقت کو مختلف نظریات بالکل مختلف انداز میں دیکھتے ہیں، کیونکہ ہر نظریے کی بنیادی مفروضات، زاویۂ نظر اور اہم سوالات جدا ہوتے ہیں۔ ان نظریات میں فعلیت پسندی اور تصادم نظریہ دو بڑی اور ایک دوسرے سے متضاد روایتیں ہیں۔ فعلیت پسندی معاشرے کو اتفاق، ہم آہنگی اور توازن کی نظر سے دیکھتی ہے، جبکہ تصادم نظریہ اسے طاقت، مفادات کی کشمکش اور عدم مساوات کے آئینے میں پرکھتا ہے۔ ذیل میں دونوں نظریات کا تعارف، ان کا تقابلی جائزہ اور یہ وضاحت پیش کی گئی ہے کہ یہ معاشرتی حقیقت کو کس طرح مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔

فعلیت پسندی: بنیادی خیالات

فعلیت پسندی، جسے ساختی فعلیت پسندی بھی کہا جاتا ہے، عمرانیات کا قدیم اور بااثر نظریہ ہے۔ اس کے نمایاں مفکرین میں ایمیل ڈرخائم، ٹالکاٹ پارسنز اور رابرٹ مرٹن شامل ہیں۔ اس نظریے کے مطابق معاشرہ ایک نظام ہے جو باہم مربوط حصوں، مثلاً خاندان، تعلیم، مذہب، معیشت اور ریاست، پر مشتمل ہے۔ جس طرح انسانی جسم کے اعضاء مل کر جسم کو زندہ رکھتے ہیں، اسی طرح ہر سماجی ادارہ پورے معاشرے کی بقا اور استحکام کے لیے کوئی نہ کوئی فعل انجام دیتا ہے۔ خاندان نسل کی افزائش اور سماج کاری کرتا ہے، تعلیم مہارت اور اقدار منتقل کرتی ہے، مذہب اخلاقی یکجہتی پیدا کرتا ہے اور ریاست نظم و ضبط قائم رکھتی ہے۔ ڈرخائم کے نزدیک معاشرے کو باندھنے والی اصل چیز مشترکہ اقدار اور اجتماعی ضمیر ہے؛ جب تمام افراد بنیادی اقدار پر متفق ہوں تو ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔

پارسنز نے اس خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ہر سماجی نظام کو زندہ رہنے کے لیے چار ضروریات پوری کرنا ہوتی ہیں: ماحول سے مطابقت، اہداف کا حصول، انضمام اور اقدار کی حفاظت۔ مرٹن نے فعلیت پسندی میں اہم اصلاحات کیں؛ اس نے واضح اور پوشیدہ افعال میں فرق کیا اور یہ بھی تسلیم کیا کہ بعض ادارے معاشرے کے لیے نقصان دہ افعال بھی انجام دے سکتے ہیں، جنہیں معطل افعال کہا جاتا ہے۔ فعلیت پسندی کے نزدیک سماجی تبدیلی عموماً بتدریج اور پُرامن ہوتی ہے اور اس کا رجحان توازن کی طرف لوٹنے کا ہوتا ہے۔ مسائل، مثلاً جرم یا غربت، اس نظریے میں نظام کی عارضی خرابی کے طور پر دیکھے جاتے ہیں جن کا تدارک اداروں کی اصلاح سے ممکن ہے۔

تصادم نظریہ: بنیادی خیالات

تصادم نظریہ فعلیت پسندی کے بالکل برعکس نقطۂ آغاز سے چلتا ہے۔ اس کے بانی کارل مارکس سمجھے جاتے ہیں، اور بعد میں رالف ڈاہرنڈورف اور لیوس کوزر جیسے مفکرین نے اسے وسعت دی۔ اس نظریے کے مطابق معاشرہ اتفاق سے نہیں بلکہ مفادات کے تصادم سے چلتا ہے۔ ہر معاشرے میں وسائل، دولت، طاقت اور وقار محدود ہوتے ہیں اور مختلف گروہ ان پر قبضے کے لیے آپس میں کشمکش میں رہتے ہیں۔ مارکس کے نزدیک سرمایہ دارانہ معاشرے کی بنیادی کشمکش سرمایہ دار اور مزدور طبقے کے درمیان ہے، کیونکہ سرمایہ دار پیداواری وسائل کا مالک ہو کر مزدور کی محنت کا استحصال کرتا ہے۔ قانون، تعلیم اور مذہب جیسے ادارے اس نظریے میں غیر جانب دار نہیں ہوتے بلکہ اکثر طاقتور طبقے کے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔

ڈاہرنڈورف نے تصادم کو صرف معاشی طبقات تک محدود نہیں رکھا بلکہ کہا کہ ہر تنظیم اور ادارے میں اختیار رکھنے والوں اور اختیار سے محروموں کے درمیان تصادم ناگزیر ہے۔ کوزر نے ایک اہم نکتہ بھی شامل کیا کہ تصادم ہمیشہ تباہ کن نہیں ہوتا؛ بسا اوقات یہ معاشرے کی خرابیوں کو بے نقاب کر کے اصلاح اور تبدیلی کا سبب بنتا ہے اور گروہوں کی داخلی یکجہتی بڑھاتا ہے۔ تصادم نظریے کے نزدیک تبدیلی معاشرے کی فطرت ہے، وہ اچانک اور بنیادی بھی ہو سکتی ہے، اور موجودہ نظم اکثر انصاف پر نہیں بلکہ طاقت کے توازن پر قائم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ نظریہ عدم مساوات، استحصال اور محرومی کو مطالعے کا مرکز بناتا ہے۔

دونوں نظریات کا تقابلی جائزہ

دونوں نظریات کے درمیان فرق کو درج ذیل جدول سے واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے:

جدول 1: فعلیت پسندی اور تصادم نظریے کا موازنہ

پہلو	فعلیت پسندی	تصادم نظریہ
معاشرے کی نوعیت	باہم مربوط حصوں کا منظم نظام جو توازن کی طرف مائل ہے	مفادات کے متصادم گروہوں کا میدان جس میں کشمکش جاری ہے
مرکزی سوال	معاشرہ قائم اور منظم کیسے رہتا ہے؟	طاقت اور وسائل پر قبضہ کس کے پاس ہے اور محروم کون ہے؟
اقدار کا کردار	مشترکہ اقدار معاشرے کو باندھتی ہیں اور اتفاق کی بنیاد ہیں	حاکم اقدار اکثر طاقتور طبقے کے مفادات کی عکاس ہوتی ہیں
اداروں کا کردار	ہر ادارہ پورے معاشرے کی فلاح کے لیے عمل انجام دیتا ہے	ادارے اکثر موجودہ بالادستی کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بنتے ہیں
تبدیلی کی نوعیت	بتدریج، پُرامن اور توازن بحال کرنے والی	ناگہیر، کبھی اچانک اور بنیادی؛ تصادم اس کا محرک ہے
عدم مساوات	قابلیت اور اہم عہدوں کی بنیاد پر ایک فطری اور مفید عمل	استحصال اور ناانصافی کی علامت جو بدلنی چاہیے
نمایاں مفکرین	ڈرخائم، پارسنز، مرٹن	مارکس، ڈاہرنڈورف، کوزر

جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ اختلاف جزئیات کا نہیں بلکہ بنیادی مفروضات کا ہے۔ فعلیت پسند جب تعلیمی نظام کو دیکھتا ہے تو اسے مہارت کی منتقلی اور میرٹ کی بنیاد پر درجہ بندی کا ذریعہ سمجھتا ہے؛ تصادم پسند اسی نظام میں یہ دیکھتا ہے کہ امیر طبقات کے بچوں کو بہتر اسکول اور مواقع ملنے سے عدم مساوات نسل در نسل منتقل ہوتی ہے۔ اسی طرح فعلیت پسند قانون کو اجتماعی اقدار کا محافظ کہتا ہے، جبکہ تصادم پسند پوچھتا ہے کہ قانون بنانے اور نافذ کرنے میں کس طبقے کا مفاد غالب ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو مکمل درست اور دوسرے کو مکمل غلط قرار دینا مناسب نہیں، کیونکہ ہر ایک حقیقت کے ایک پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔

یہ نظریات معاشرتی حقیقت کو مختلف انداز میں کیسے بیان کرتے ہیں؟

معاشرتی حقیقت سے مراد وہ سماجی زندگی ہے جسے ہم روزمرہ میں جیتے ہیں: خاندانی تعلقات، روزگار، تعلیم، مذہب، سیاست اور طبقاتی فرق۔ فعلیت پسندی اس حقیقت کی تشریح اوپر سے نیچے کی طرف کرتی ہے؛ اس کے نزدیک فرد کی زندگی بڑے نظام کے اندر ڈھلی ہوتی ہے، اقدار اور اصول فرد کو معاشرے سے جوڑتے ہیں اور فرد عموماً طے

شدہ کردار ادا کر کے نظام کو مضبوط کرتا ہے۔ اس تشریح میں حقیقت کا حسن اس کی ہم آہنگی ہے، اور بحران عارضی خلل ہے۔ مثال کے طور پر غربت کو فعلیت پسند ناقص سماج کاری، تعلیم کی کمی یا اداروں کی کمزوری سے جوڑے گا اور اس کا حل ادارہ جاتی اصلاح میں تلاش کرے گا۔

اس کے برعکس تصادم نظریہ حقیقت کو نیچے سے، یعنی محروم اور اتحت گروہوں کے تجربے سے دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک جو چیز فعلیت پسند کو ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے، وہ دراصل طاقتور کی جیت اور کمزور کی خاموش رضامندی بھی ہو سکتی ہے۔ غربت اس نظر میں فردی ناکامی نہیں بلکہ دولت اور مواقع کی غیر منصفانہ تقسیم کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے دونوں نظریے تحقیقی سوالات بھی مختلف بناتے ہیں: فعلیت پسند پوچھتا ہے کہ فلاں ادارہ معاشرے کے لیے کیا کرتا ہے، جبکہ تصادم پسند پوچھتا ہے کہ فلاں انتظام سے فائدہ کسے پہنچتا ہے اور نقصان کسے ہوتا ہے۔ عملی زندگی میں پالیسی سازی پر بھی یہی فرق اثر کرتا ہے؛ پہلی سوچ اصلاح پسند پالیسیاں بناتی ہے، دوسری سوچ وسائل کی از سرِ نو تقسیم اور ساختی تبدیلی کا مطالبہ کرتی ہے۔ سچی سمجھ اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب محقق دونوں زاویے ذہن میں رکھ کر حقیقت کے دونوں رخ دیکھے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ فعلیت پسندی اور تصادم نظریہ معاشرے کو سمجھنے کے دو بڑے اور متضاد آئینے ہیں۔ فعلیت پسندی نظم، اتفاق، مشترکہ اقدار اور اداروں کے مثبت افعال پر زور دیتی ہے، جبکہ تصادم نظریہ طاقت، عدم مساوات، مفادات کی کشمکش اور تبدیلی کو مرکزی حیثیت دیتا ہے۔ دونوں نظریات معاشرتی حقیقت کو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں کیونکہ ان کے سوالات، مفروضات اور توجہ کے مراکز مختلف ہیں۔ ایک باشعور طالب علم اور محقق کے لیے درست طرزِ یہ ہے کہ وہ کسی ایک نظریے کا اسیر نہ بنے بلکہ مسئلے کی نوعیت کے مطابق دونوں سے استفادہ کرے، کیونکہ معاشرہ بہ یک وقت ہم آہنگی اور کشمکش دونوں کا مجموعہ ہے۔

سوال نمبر 3: فرد اور معاشرے کا باہمی تعلق — اقدار، رویے اور شناخت (20 نمبر)

سوال نمبر 3: فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق پر بحث کریں اور وضاحت کریں کہ سماجی اقدار فرد کے رویوں اور شناخت کو کیسے متاثر کرتی ہیں۔ (20)

تعارف

عمرانیات کا بنیادی سوال یہی ہے کہ فرد اور معاشرہ آپس میں کس رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ بظاہر فرد ایک الگ، سوچنے سمجھنے والی ہستی ہے اور معاشرہ اس سے باہر کھڑا کوئی مجموعہ محسوس ہوتا ہے، مگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔ انسان پیدا ہوتے ہی ایک خاندان، زبان، مذہب، رسم و رواج اور اقدار کے ماحول میں آنکھ کھولتا ہے؛ اس کی زبان، خوراک، لباس، پسند ناپسند حتیٰ کہ اس کی شناخت بھی اسی ماحول سے بنتی ہے۔ دوسری طرف معاشرہ بھی کوئی ہوا میں معلق چیز نہیں؛ وہ افراد ہی کے باہمی تعلقات، افعال اور اداروں سے بنتا ہے۔ اگر افراد تعاون چھوڑ دیں تو معاشرہ بکھر جائے۔ ذیل میں اس باہمی تعلق کی نوعیت، سماج کاری کے عمل اور پھر خاص طور پر اس بات کی وضاحت پیش کی گئی ہے کہ سماجی اقدار فرد کے رویوں اور شناخت کو کس طرح تشکیل دیتی ہیں۔

فرد اور معاشرے کا باہمی تعلق

فرد اور معاشرے کا تعلق ایک طرفہ نہیں بلکہ باہمی اور دوطرفہ ہے۔ معاشرہ فرد کو تربیت، تحفظ، شناخت اور زندگی گزارنے کے اصول فراہم کرتا ہے۔ بچہ خاندان سے زبان اور اخلاق سیکھتا ہے، اسکول سے علم اور مہارت حاصل کرتا ہے، اور مختلف اداروں کے ذریعے ایک مفید شہری بنتا ہے۔ اس کے بدلے میں فرد اپنے کردار ادا کر کے معاشرے کو چلاتا ہے؛ بطور والدین، استاد، مزدور، تاجر یا شہری وہ ان اداروں کو زندگی بخشتا ہے جن سے معاشرہ قائم ہے۔ ڈرخائم نے کہا تھا کہ معاشرہ فرد سے ماورا ایک حقیقت ہے جو فرد پر دباؤ بھی ڈالتی ہے اور اسے راستہ بھی دکھاتی ہے۔ دوسری طرف عظیم شخصیات، مصلحین اور قائدین فرد ہوتے ہوئے بھی پورے معاشرے کی سمت بدل دیتے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ فرد محض معاشرے کا مہرہ نہیں بلکہ اس کا معمار بھی ہے۔

اس تعلق کو حیاتیاتی مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے: جس طرح جسم اعضاء کے بغیر اور عضو جسم کے بغیر مفہوم نہیں رکھتا، اسی طرح معاشرہ افراد کے بغیر اور فرد سماجی ماحول کے بغیر ارتقا نہیں پا سکتا۔ جنگلوں میں پلنے یا تنہائی میں پرورش پانے والے بچوں کے واقعات بتاتے ہیں کہ سماجی میل جول کے بغیر انسان زبان، آداب اور شناخت سے محروم رہ جاتا ہے۔ لہٰذا فرد کی شخصیت سماجی آئینے میں بنتی ہے اور معاشرے کی صحت اس کے افراد کے رویوں پر منحصر ہوتی ہے؛ یہ ایک مسلسل گردش ہے جس میں ہر ایک دوسرے کو بناتا بھی ہے اور اس سے بنتا بھی ہے۔

سماج کاری: تعلق کو قائم کرنے والا عمل

فرد اور معاشرے کو جوڑنے والا بنیادی عمل سماج کاری ہے۔ سماج کاری سے مراد وہ زندگی بھر جاری رہنے والا عمل ہے جس کے ذریعے فرد اپنے معاشرے کی اقدار، اصول، زبان، کردار اور توقعات سیکھ کر اس کا کارآمد رکن بنتا ہے۔ اس کے نمایاں ذرائع میں خاندان، تعلیمی ادارے، ہم عمر ساتھی، مذہب اور ذرائع ابلاغ شامل ہیں۔ خاندان میں بچہ محبت، اطاعت اور بڑوں کے احترام کا پہلا سبق سیکھتا ہے۔ اسکول میں وہ نظم وضبط، مقابلہ اور تعاون سیکھتا ہے؛ ساتھیوں میں اسے دوستی اور سماجی قبولیت کا تجربہ ہوتا ہے۔ جارج ہربرٹ میڈ کے مطابق بچہ دوسروں کے کردار اپنانے سے "خود" کا تصور بناتا ہے اور کولے کے "آئینہ نما خود" کے تصور کے مطابق ہم اپنے آپ کو اسی طرح دیکھتے ہیں جس طرح دوسرے ہمیں دیکھتے ہیں۔ یہی عمل فرد کو معاشرے کی اقدار اپنے اندر اتارنے میں مدد دیتا ہے۔

سماجی اقدار فرد کے رویوں کو کیسے متاثر کرتی ہیں؟

اقدار وہ مشترکہ معیارات ہیں جو بتاتی ہیں کہ معاشرے میں کیا اچھا، مطلوب اور قابلِ قدر ہے اور کیا برا اور ناپسندیدہ ہے، مثلاً سچائی، انصاف، بڑوں کا احترام، وقت کی پابندی، ملکی وفاداری اور کمزور کی مدد۔ رویہ کسی شخص، چیز یا خیال کے بارے میں پسند یا ناپسند کا وہ ذہنی رجحان ہے جو اس کے عمل کو سمت دیتا ہے۔ اقدار رویوں کی جڑ ہیں؛ جب کوئی قدر فرد کے دل و دماغ میں رچ بس جاتی ہے تو وہ اس کے رویوں اور روزمرہ فیصلوں میں خود بخود جھلکنے لگتی ہے۔ جس معاشرے میں ایمان داری بلند قدر ہو، وہاں کا فرد رشوت کو محض قانونی جرم نہیں بلکہ اخلاقی عیب سمجھتا ہے؛ جہاں وقت کی قدر ہو، وہاں دفاتر اور ملاقاتوں میں پابندی رویہ بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس جہاں دولت کو ہر قیمت پر سب سے بڑی قدر قرار دیا جائے، وہاں شارٹ کٹ، دکھاوا اور خود غرضی کے رویے پروان چڑھتے ہیں۔

اقدار رویوں پر اثر کئی ذرائع سے ڈالتی ہیں۔ اول، تربیت اور تلقین سے: والدین اور اساتذہ اقدار کو نصیحت اور اپنے نمونے سے بچوں میں منتقل کرتے ہیں۔ دوم، انعام و سزا سے: معاشرہ اقدار کے مطابق عمل کرنے والے کو عزت اور انحراف کرنے والے کو بدنامی یا سزا دیتا ہے، جس سے رویے ڈھلتے ہیں۔ سوم، اندرونی اپنائیت سے: بالغ فرد اقدار کو صرف بیرونی دباؤ سے نہیں مانتا بلکہ انہیں اپنے ضمیر کا حصہ بنا لیتا ہے، اس لیے وہ تنہائی میں بھی انہی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ چہارم، اداروں کے ذریعے: قانون، نصاب اور

میڈیا اقدار کو مسلسل دہراتے رہتے ہیں۔ تاہم یہ اثر مطلق نہیں ہوتا؛ معاشی دباؤ، تعلیم، ذاتی تجربہ اور دوسری ثقافتوں سے رابطہ رویوں کو بدل بھی سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی معاشرے کے اندر مختلف طبقات اور نسلوں کے رویوں میں فرق نظر آتا ہے۔

سماجی اقدار اور فرد کی شناخت

شناخت سے مراد فرد کا یہ احساس ہے کہ "میں کون ہوں" اور دوسروں کی نظر میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ شناخت کی دو بڑی صورتیں ہیں: ذاتی شناخت، جو فرد کی انفرادی خصوصیات سے بنتی ہے، اور سماجی شناخت، جو اس کے گروہوں سے وابستگی سے بنتی ہے، مثلاً خاندان، قوم، مذہب، زبان، پیشہ اور علاقہ۔ سماجی اقدار شناخت کی تعمیر میں مرکزی کردار ادا کرتی ہیں۔ جب فرد اپنے گروہ کی اقدار کو اپناتا ہے تو اسے تعلق اور تحفظ کا احساس ملتا ہے، مثلاً وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ میری قوم کی روایت ہے، یہ میرے مذہب کی تعلیم ہے، یہ میرے پیشے کا تقاضا ہے۔ اقدار فرد کو زندگی کا مقصد بھی دیتی ہیں، کیونکہ جن چیزوں کو معاشرہ قابلِ قدر سمجھتا ہے، فرد انہی کے حصول میں اپنی کامیابی اور ناکامی ناپتا ہے۔

شناخت اور اقدار کا یہ تعلق زندگی بھر بدلتا رہتا ہے۔ نوجوانی میں ساتھیوں کے گروہ کی اقدار والدین کی اقدار سے ٹکرا سکتی ہیں، جس سے شناخت کا بحران پیدا ہوتا ہے۔ ہجرت کرنے والے افراد دو ثقافتوں کی اقدار کے درمیان اپنی شناخت نئے سرے سے ترتیب دیتے ہیں۔ جدید دور میں سوشل میڈیا نئی اقدار، مثلاً شہرت اور فوری مقبولیت، کو فروغ دے رہا ہے جس سے نوجوانوں کی شناخت اور خود اعتمادی متاثر ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود زیادہ تر افراد اپنی بنیادی سماجی اقدار سے جڑے رہتے ہیں، کیونکہ یہی اقدار انہیں معاشرے میں قابلِ قبول اور باعزت مقام دلاتی ہیں۔ اگر کوئی فرد اجتماعی اقدار سے مکمل انحراف کرے تو اسے سماجی ناپسندیدگی اور شناخت کے بکھراؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جو اس باہمی تعلق کی طاقت کو ظاہر کرتا ہے۔

توازن: انفرادیت اور سماجی ضبط

یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ فرد اور معاشرے کا صحت مند تعلق توازن کا نام ہے۔ اگر معاشرہ فرد کو بالکل اپنے سانچے میں ڈھالنے لگے تو تخلیق، آزادیِ فکر اور ترقی رک جاتی ہے؛ اور اگر ہر فرد اجتماعی اقدار و اصولوں کو مکمل ٹھکرا دے تو بے ترتیبی اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ ترقی یافتہ معاشرے وہی ہیں جہاں بنیادی اقدار پر اتفاق کے ساتھ فرد کو

سوال اٹھانے، اختلاف کرنے اور نئی راہیں تلاش کرنے کی گنجائش بھی ملتی ہے۔ بہت سی سماجی اصلاحات اسی گنجائش سے پیدا ہوئیں؛ افراد نے کسی غلط رسم یا ناانصافی کو چیلنج کیا اور بتدریج معاشرے کی اقدار خود بدل گئیں۔ یوں اقدار صرف فرد کو متاثر نہیں کرتیں، فرد کی collective کوشش اقدار کو بھی وقت کے ساتھ نئی شکل دیتی ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ فرد اور معاشرہ لازم و ملزوم ہیں: معاشرہ فرد کو زبان، تربیت، اقدار اور شناخت دیتا ہے اور فرد اپنے کرداروں سے معاشرے کو چلاتا اور بدلتا ہے۔ سماج کاری وہ پل ہے جس سے اقدار فرد کے اندر اترتی ہیں، پھر یہی اقدار اس کے رویوں کی سمت طے کرتی ہیں کہ وہ کس چیز کو پسند کرے، کس سے پرہیز کرے اور کن مقاصد کے لیے کوشش کرے۔ ساتھ ہی اقدار فرد کی ذاتی و سماجی شناخت کی بنیاد بنتی ہیں اور اسے تعلق، مقصد اور مقام کا احساس دیتی ہیں۔ اس باہمی تعلق کو سمجھے بغیر نہ شخصیت کی تشکیل سمجھ آتی ہے اور نہ ہی معاشرتی نظم و تبدیلی کی وضاحت ممکن ہے۔

سوال نمبر 4: ثقافت کے اجزاء اور ثقافتی تبدیلی کا معاشرتی ہم آہنگی پر اثر (20 نمبر)

سوال نمبر 4: ثقافت کے اجزاء (Beliefs ,Norms ,Values) کی وضاحت کریں اور بیان کریں کہ ثقافتی تبدیلی معاشرتی ہم آہنگی کو کیسے متاثر کرتی ہے۔ (20)

تعارف

ثقافت کسی معاشرے کی زندگی کا مجموعی انداز ہے۔ اس میں وہ سب کچھ شامل ہے جو انسان معاشرے کے رکن کی حیثیت سے سیکھتا ہے: زبان، علم، عقائد، اخلاق، رسم و رواج، فن، خوراک، لباس اور ٹیکنالوجی۔ ٹائلر کی معروف تعریف کے مطابق ثقافت وہ پیچیدہ مجموعہ ہے جس میں علم، عقیدہ، فن، اخلاق، قانون اور رسم و رواج شامل ہیں۔ ثقافت ورثے میں خون کی طرح نہیں ملتی بلکہ سماج کاری کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی ہے۔ اس کے عناصر کو دو حصوں میں سمجھا جا سکتا ہے: مادی ثقافت، مثلاً عمارتیں، اوزار اور لباس، اور غیر مادی ثقافت، مثلاً اقدار، اصول اور عقائد۔ غیر مادی ثقافت ہی دراصل معاشرے کو اندر سے باندھتی ہے۔ ذیل میں ثقافت کے تین بنیادی اجزاء، یعنی اقدار (Values)، اصول و معیارات (Norms) اور عقائد (Beliefs)، کی وضاحت کی جائے گی اور پھر یہ بتایا جائے گا کہ ثقافتی تبدیلی معاشرتی ہم آہنگی کو کس طرح متاثر کرتی ہے۔

اقدار(Values)

اقدار ثقافت کا سب سے گہرا اور مرکزی جزہیں۔ یہ وہ اجتماعی تصورات ہیں جو طے کرتے ہیں کہ کیا صحیح اور غلط، اچھا اور برا، مطلوب اور ناپسندیدہ ہے۔ ہر معاشرے کی کچھ بنیادی اقدار ہوتی ہیں، مثلاً پاکستانی معاشرے میں مہمان نوازی، بڑوں کا احترام، خاندانی یکجہتی، مذہبی عقیدت اور سچائی کو بلند مقام حاصل ہے، جبکہ مغربی معاشروں میں انفرادی آزادی، مساوات اور وقت کی پابندی کو نسبتاً زیادہ مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اقدار تجریدی ہوتی ہیں؛ وہ خود کسی عمل کا نام نہیں بلکہ اس معیار کا نام ہیں جس سے عمل کو پرکھا جاتا ہے۔ انہی اقدار سے قوانین بنتے ہیں، تعلیمی مقاصد طے ہوتے ہیں اور افراد اپنے مقاصد زندگی کا انتخاب کرتے ہیں۔ جب کسی معاشرے کی اقدار واضح اور مشترک ہوں تو مفاہمت آسان ہوتی ہے، اور جب اقدار میں ابہام یا ٹکراؤ پیدا ہو تو سماجی کشمکش جنم لیتی ہے۔

اصول و معیارات(Norms)

اصول یا معیارات اقدار کا عملی روپ ہیں۔ یہ وہ متوقع رویے کے ضابطے ہیں جو بتاتے ہیں کہ کسی خاص موقع پر فرد کو کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اقدار اگر منزل ہیں تو اصول اس منزل تک پہنچنے کے راستے ہیں؛ مثلاً "بڑوں کا احترام" ایک قدر ہے، جبکہ بڑے کے آنے پر کھڑے ہونا، سلام کرنا اور اس کی بات توجہ سے سننا اس قدر سے جڑے اصول ہیں۔ اصولوں کی عموماً تین اقسام بیان کی جاتی ہیں: لوک ریتیں، یعنی روزمرہ کی غیر رسمی عادتیں جیسے کھانے اور ملنے جلنے کے آداب، جن کی خلاف ورزی پر ہلکی ناپسندیدگی ہوتی ہے؛ اخلاقی رسوم، جن کی خلاف ورزی کو سنجیدہ اخلاقی برائی سمجھا جاتا ہے؛ اور قوانین، جو ریاست کی طرف سے تحریری شکل میں نافذ ہوتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی پر باقاعدہ سزا ملتی ہے۔ اصولوں کے ساتھ انعام و سزا کا نظام جڑا ہوتا ہے جسے سماجی منظوریاں کہتے ہیں؛ یہی منظوریاں اصولوں کو محض مشورے سے بڑھا کر موثر ضابطہ بناتی ہیں۔

عقائد(Beliefs)

عقائد سے مراد وہ بیانات اور تصورات ہیں جنہیں کسی معاشرے کے افراد درست اور مبنی بر حقیقت سمجھتے ہیں۔ یہ عقائد مذہبی بھی ہو سکتے ہیں، مثلاً خدا کے وجود، آخرت اور مقدس کتابوں پر ایمان؛ سائنسی بھی، مثلاً زمین کا سورج کے گرد گھومنا؛ اور عام سماجی تصورات بھی، مثلاً یہ یقین کہ تعلیم ترقی کی کنجی ہے یا یہ روایتی خیال کہ بعض دن و ساعت منحوس ہوتے ہیں۔ عقائد اقدار سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ جو چیز سچ مانی جائے اسی کے مطابق قدر و قیمت طے ہوتی ہے؛ مثال کے طور پر آخرت کے عقیدے سے صدقہ، انصاف اور امانت داری جیسی اقدار کو تقویت ملتی ہے۔ سائنس کی ترقی سے بہت سے پرانے عقائد بدل جاتے ہیں، جس سے رویے بھی بدلتے ہیں، مثلاً بیماریوں کو آسیب کا اثر

سمجھنے کی جگہ علاج اور ویکسینیشن پر اعتماد نے صحت کے رویے تبدیل کر دیے۔ عقائد ثقافت کو معنوی بنیاد فراہم کرتے ہیں اور انسان کے خوف، امید اور مقصد کو شکل دیتے ہیں۔

تینوں اجزاء کا باہمی تعلق

یہ تینوں اجزاء الگ الگ جزیرے نہیں بلکہ ایک زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ عقائد بتاتے ہیں کہ دنیا کیسی ہے، اقدار یہ طے کرتی ہیں کہ اس میں اچھا کیا ہے، اور اصول یہ ہدایت دیتے ہیں کہ عملاً کیا کرنا چاہیے۔ درج ذیل جدول اس تعلق کو مثال کے ساتھ واضح کرتا ہے۔

جدول 1: ثقافت کے اجزاء اور ان کا باہمی تعلق

جز	مفہوم	مثال
عقائد (Beliefs)	جن باتوں کو سچ اور حقیقت مانا جائے	علم حاصل کرنا ہر انسان کے لیے مفید اور ضروری ہے
اقدار (Values)	اچھے اور برے کا مشترکہ معیار	تعلیم، ایمان داری، بڑوں کا احترام قابلِ قدر ہیں
اصول (Norms)	متوقع رویے کے عملی ضابطے	استاد کا احترام کرنا، قطار میں کھڑے ہونا، وقت پر پہنچنا

جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عقیدہ بدل جائے تو قدر بھی متزلزل ہوتی ہے اور اصول بھی اپنی بنیاد کھو بیٹھتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی نیا اصول قانون بن کر نافذ ہو، مثلاً خواتین کی تعلیم یا ووٹ کے حق کا باقاعدہ انتظام، تو آہستہ آہستہ اقدار اور عقائد بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس باہمی انحصار کی وجہ سے ثقافت ایک متوازن نظام کی صورت میں قائم رہتی ہے، اور کسی ایک جز میں اچانک بڑی تبدیلی پورے نظام میں ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔

ثقافتی تبدیلی اور معاشرتی ہم آہنگی

ثقافت جامد نہیں ہوتی؛ ایجادات، دریافتیں، دوسری ثقافتوں سے رابطہ، تعلیم، شہری آبادکاری اور مواصلات کی ترقی اسے مسلسل بدلتے رہتے ہیں۔ ہم آہنگی سے مراد معاشرے کے مختلف حصوں کا ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت میں رہنا اور افراد کا مشترکہ اقدار پر بنیادی اتفاق ہے۔ ثقافتی تبدیلی اس ہم آہنگی کو دونوں طرح متاثر کرتی ہے۔ مثبت صورت یہ ہے کہ تبدیلی بتدریج ہو اور معاشرہ اسے اپنے اندر جذب کر لے؛ مثال کے طور پر موبائل فون اور انٹرنیٹ پہلے اجنبی لگے، مگر چند برسوں میں وہ تعلیم، کاروبار اور

رابطے کا قدرتی حصہ بن گئے اور ہم آہنگی بحال ہو گئی۔ ایسی تبدیلیاں معاشرے کو جمود سے نکال کر ترقی کی راہ پر بھی ڈالتی ہیں، مثلاً لڑکیوں کی تعلیم کی قبولیت نے خاندان اور معیشت دونوں کو نئی قوت دی۔

مشکل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب تبدیلی کی رفتار غیر متوازن ہو۔ ماہرِ عمرانیات او گبرن نے اسے "ثقافتی تاخیر" (Cultural Lag) کا نام دیا: مادی ثقافت، مثلاً ٹیکنالوجی، تیزی سے بدلتی ہے مگر غیر مادی ثقافت، یعنی اقدار، اصول اور قوانین، پیچھے رہ جاتی ہے، اور اس فاصلے سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ سوشل میڈیا کی تیز رفتار ترقی اور اس کے استعمال کے اخلاقی و قانونی ضابطوں کے پیچھے رہ جانے سے سائبر ہراسانی، جعلی خبریں اور رازداری کے مسائل اسی تاخیر کی مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ نسلوں کے درمیان اقدار کا ٹکراؤ، بزرگوں اور نوجوانوں کے درمیان سوچ کا فرق، اور بیرونی ثقافت کی بے سوچی تقلید بھی ہم آہنگی کو کمزور کرتی ہے۔ بعض خاندانوں میں یہی فرق غلط فہمیوں اور فاصلوں کا سبب بنتا ہے۔

تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم آہنگی کا مطلب اختلاف کا مکمل خاتمہ نہیں ہوتا۔ صحت مند معاشرے بحث، اصلاح اور نئے خیالات کی گنجائش رکھتے ہوئے بنیادی اقدار پر متفق رہتے ہیں۔ ثقافتی تبدیلی کے منفی اثرات کو کم کرنے کے لیے تعلیم سب سے موثر ذریعہ ہے، کیونکہ باشعور فرد نئی چیز کو پرکھ کر اپناتا ہے اور اپنی بنیادی اقدار سے بھی جڑا رہتا ہے۔ قانون سازی، میڈیا کی ذمہ دارانہ کردار کشی اور نسلوں کے درمیان مکالمہ بھی منتقلی کے دور کو آسان بناتے ہیں۔ پاکستان جیسے معاشرے کے لیے راستہ یہی ہے کہ جدید علم و ٹیکنالوجی کو اپناتے ہوئے اپنی مثبت اقدار، مثلاً خاندانی یکجہتی اور مہمان نوازی، کی حفاظت کی جائے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ ثقافت کے تین بنیادی اجزاء عقائد، اقدار اور اصول باہم مل کر انسانی رویوں کو سمت دیتے ہیں: عقائد حقیقت کا تصور دیتے ہیں، اقدار پسند و ناپسند کا معیار مہیا کرتی ہیں اور اصول عملی برتاؤ کے ضابطے فراہم کرتے ہیں۔ ثقافتی تبدیلی ایک فطری اور ناگزیر عمل ہے؛ جب یہ متوازن اور بتدریج ہو تو معاشرتی ہم آہنگی برقرار رہتی ہے اور ترقی بھی ہوتی ہے، لیکن جب مادی اور غیر مادی ثقافت کے درمیان فاصلہ بڑھ جائے یا نسلوں کی اقدار بری طرح ٹکرا جائیں تو ہم آہنگی متاثر ہوتی ہے۔ تعلیم، مکالمہ اور سوچی سمجھی پالیسی سے اس دورِ منتقلی کو معاشرے کے لیے نقصان کے بجائے بہتری کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

سوال نمبر 5: مختصر نوٹ ــــ معیاری و مقداری تحقیق میں فرق؛ پاکستان کے اہم سماجی مسائل (10 + 10 نمبر)

سوال نمبر 5: مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ تحریر کریں: 1. معیاری (Qualitative) اور مقداری (Quantitative) تحقیق میں فرق (10) ــ 2. پاکستان میں موجود اہم سماجی مسائل کا مختصر جائزہ (10)

حصہ (1): معیاری اور مقداری تحقیق میں فرق

سماجی تحقیق کو مواد کی نوعیت اور طریقِ کار کی بنیاد پر دو بڑی اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے: مقداری تحقیق اور معیاری تحقیق۔ مقداری تحقیق میں سماجی مظاہر کو اعداد، تناسب اور پیمائش کی زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں سوالنامے، بند سوالات، مردم شماری اور شماریاتی تجزیے کا استعمال ہوتا ہے، نمونہ عموماً بڑا ہوتا ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ نتائج کو پوری آبادی پر لاگو کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر یہ جاننا کہ کسی صوبے میں کتنے فیصد بچے اسکول سے باہر ہیں، مقداری تحقیق کا کام ہے۔ اس کی خوبصورتی اس کی معروضیت، موازنے کی صلاحیت اور بڑے پیمانے کی تصویر پیش کرنے میں ہے، مگر کمزوری یہ ہے کہ اعداد رویوں کے پیچھے چھپے معنی اور جذبات کو پوری طرح بیان نہیں کر پاتے۔

اس کے برعکس معیاری تحقیق مظاہر کی گہرائی، معنی اور تناظر کو سمجھنے پر توجہ دیتی ہے۔ اس میں گہرے انٹرویو، گروہی مباحثے، شراکتی مشاہدہ اور کیس اسٹڈی جیسے طریقے استعمال ہوتے ہیں، نمونہ چھوٹا مگر منتخب ہوتا ہے، اور مواد اعداد کے بجائے الفاظ، بیانات اور مشاہدات کی صورت میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ سمجھنا کہ اسکول سے باہر بچوں کے والدین تعلیم کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں اور کن دباؤ کا شکار ہیں، معیاری تحقیق کا موضوع ہے۔ اس کی خوبصورتی حقیقت کی بھرپور اور انسانی تصویر پیش کرنے میں ہے، جبکہ اس کی حد یہ ہے کہ چھوٹے نمونے کے نتائج کو پوری آبادی پر عام کرنا مشکل ہوتا ہے اور محقق کی ذاتی تشریح اثر انداز ہو سکتی ہے۔ دونوں طریقوں کا خلاصہ درج ذیل جدول میں پیش کیا گیا ہے:

جدول 1: معیاری اور مقداری تحقیق کا فرق

پہلو	معیاری تحقیق (Qualitative)	مقداری تحقیق (Quantitative)
مقصد	معنی، وجوہات اور تجربے کی گہرائی سمجھنا	پیمائش، تناسب اور عمومی رجحان معلوم کرنا

مواد کی شکل	الفاظ، بیانات، مشاہدات	اعداد، فیصد، شماریاتی جدول
طریقے	گہرا انٹرویو، گروہی بحث، مشاہدہ، کیس اسٹڈی	سروے، سوالنامہ، مردم شماری، تجربہ
نمونے کا حجم	چھوٹا اور مقصدی منتخب	بڑا اور نمائندہ
نتائج کی عمومیت	محدود؛ مخصوص تناظر سے متعلق	وسیع؛ آبادی پر اطلاق ممکن
محقق کا کردار	قریبی شریک اور تشریح کنندہ	فاصلے پر رہنے والا معروضی ناپنے والا

جدید تحقیق میں دونوں طریقوں کو دشمن نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایک دوسرے کا تکملہ مانا جاتا ہے۔ بہت سے بڑے مطالعات مخلوط طریقہ اختیار کرتے ہیں: پہلے معیاری تحقیق سے مسئلے کی گہرائی اور مقامی معنی سمجھے جاتے ہیں، پھر مقداری سروے سے ان نتائج کو بڑے پیمانے پر پرکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر صحت کے کسی پروگرام میں پہلے ماؤں کے انٹرویوز سے ویکسینیشن سے ہچکچاہٹ کی وجوہات معلوم کی جاتی ہیں، پھر سروے سے یہ گنتی کی جاتی ہے کہ ہچکچاہٹ کس کس علاقے میں کتنے فیصد ہے۔ یوں فرق کو سمجھ کر درست موقع پر درست طریقہ چننا ہی اچھے محقق کی پہچان ہے۔

حصہ (2): پاکستان میں موجود اہم سماجی مسائل کا مختصر جائزہ

پاکستان کو بیک وقت کئی سماجی مسائل کا سامنا ہے جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلا مسئلہ آبادی کی تیز رفتار بڑھوتری ہے؛ وسائل کی نسبت آبادی تیزی سے بڑھنے سے تعلیم، صحت، رہائش اور روزگار ہر شعبے پر دباؤ پڑتا ہے اور فی کس آمدنی میں بہتری کی رفتار سست رہتی ہے۔ اس سے جڑا ہوا دوسرا مسئلہ غربت ہے۔ مہنگائی، بے روزگاری اور آمدنی کی غیر مساوی تقسیم کی وجہ سے آبادی کا ایک بڑا حصہ خوراک، علاج اور تعلیم جیسی بنیادی ضروریات سے محروم ہے؛ غربت ہی بچوں کی مزدوری، خراب صحت اور جرم جیسے مسائل کو جنم دیتی ہے۔ تیسرا مسئلہ بے روزگاری اور کم روزگاری ہے، خاص طور پر تعلیم یافتہ نوجوانوں میں، جس سے مایوسی، ذہنی دباؤ اور بعض اوقات منفی سرگرمیوں کی طرف رجحان بڑھتا ہے۔

چوتھا بڑا مسئلہ ناخواندگی اور تعلیم کی ناہموار سہولتیں ہیں۔ کروڑوں بچے اسکول سے باہر ہیں، لڑکیوں کی شرحِ خواندگی لڑکوں سے کم ہے اور دیہی و شہری علاقوں کے درمیان معیار کا بڑا فرق ہے۔ تعلیم کی کمی باقی تقریباً تمام مسائل کو گہرا کرتی ہے، کیونکہ ناخواندہ فرد صحت، قانون اور مواقع سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھا پاتا۔ پانچواں مسئلہ صحت کی ناکافی

سہولتیں ہیں: صاف پانی اور نکاسیِ آب کی خرابی، غذائی قلت، ماؤں اور بچوں کی اموات اور دیہی علاقوں میں ڈاکٹروں و اسپتالوں کی کمی اس میں شامل ہے۔ چھٹا مسئلہ منشیات کا بڑھتا ہوا استعمال ہے جس نے نوجوان نسل کو خاص طور پر نشانہ بنایا ہے اور یہ خاندانوں کے بکھرنے اور جرائم کا بھی سبب بن رہا ہے۔

ان کے علاوہ صنفی عدم مساوات اور خواتین کو درپیش مسائل بھی اہم ہیں، مثلاً ملازمتوں میں کم شرکت، وراثت سے محرومی اور گھریلو تشدد۔ شہری مسائل میں بے ہنگم شہری آبادکاری، جھونپڑ بستیاں، ٹریفک، ماحولیاتی آلودگی اور صاف پانی کی قلت نمایاں ہیں۔ توانائی کی کمی، پانی کی بڑھتی ہوئی قلت اور موسمیاتی تبدیلی کے اثرات، جیسے سیلاب اور گرمی کی لہریں، اب سماجی مسائل کی فہرست میں سرِفہرست آ چکے ہیں، کیونکہ یہ خطرات، روزگار اور رہائش سب کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ تمام مسائل الگ الگ نہیں ہیں؛ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ غربت، ناخواندگی، آبادی اور بے روزگاری ایک زنجیر کی کڑیاں ہیں، جسے توڑنے کے لیے تعلیم، سرمایہ کاری، خاندانی منصوبہ بندی، روزگار کے مواقع، قانون کی حکمرانی اور سماجی تحفظ کے پروگراموں پر بیک وقت عمل ضروری ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ ان مسائل کے سماجی پہلو معاشی پہلوؤں سے جدا نہیں کیے جاسکتے۔ مثال کے طور پر صحت کی خرابی محض اسپتالوں کی کمی کا نتیجہ نہیں ہوتی؛ اس کے پیچھے ناخواندگی، صاف پانی کی عدم دستیابی، غذائی جہالت اور غربت بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ اسی طرح جرم اور منشیات کے مسائل کو صرف قانون نافذ کر کے ختم نہیں کیا جاسکتا جب تک بے روزگار نوجوانوں کو روزگار اور مقصد نہ دیا جائے اور خاندان و تعلیمی ادارے اپنی تربیتی ذمہ داری پوری نہ کریں۔ ماہرینِ عمرانیات اسی لیے مربوط حکمتِ عملی کی سفارش کرتے ہیں، جس میں سماجی تحقیق سے حاصل شدہ شواہد کو بنیاد بنا کر تعلیم، صحت، روزگار اور سماجی تحفظ کے پروگرام باہمی رابطے کے ساتھ چلائے جائیں۔ جب تک مسائل کو ان کی جڑوں سے سمجھ کر حل نہ کیا جائے، وقتی اقدامات وقتی راحت تو دے سکتے ہیں مگر پائیدار تبدیلی نہیں لاسکتے۔

خلاصہ

مختصر یہ کہ معیاری تحقیق گہرائی اور معنی فراہم کرتی ہے جبکہ مقداری تحقیق وسعت اور پیمائش؛ ایک اچھا محقق دونوں کی خوبیاں اور حدود جان کر مسئلے کے مطابق انتخاب کرتا ہے۔ دوسری طرف پاکستان کے سماجی مسائل باہم مربوط ہیں اور ان کا حل کسی ایک شعبے کی کوشش سے ممکن نہیں۔ تحقیق پر مبنی منصوبہ بندی، تعلیم کی ترویج اور اداروں کی بہتر کارکردگی ہی وہ راستہ ہے جس سے ان مسائل کی شدت بتدریج کم کی جاسکتی ہے۔